

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں منفرد نہیں انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا اور یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے ایک رنگ و بھم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے، اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افراد انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک، اور اختلافات میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ فلوور کنار، ایک گھر بھی بھیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں اور ایک کامیاب نظام زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو روکا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیر ترقی ہوئی ہے اسی وقت ہوئی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اصول پالے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں اور اس اتفاق میں ایسی گنجائش رکھ لی گئی ہوں کہ اختلاف طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

پاکستان میں پچھلے آٹھ سال سے جو صورت حال رونما ہے اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ اتفاق کی بنیادیں تلاش کرنے میں ہماری ناکامی ہے۔ ہمیں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنے کا

اعتبار حاصل ہوئے آٹھ سال گزر چکے ہیں، مگر جہاں ہم پیلے روز کھڑے تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں۔ بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے، اختیار پاکر بھی ہم ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے کوئی کامیاب اور قابل ذکر کوشش نہ کر سکے۔ ہمارا دستور وہی ہے۔ انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے۔ تعلیمی نظام وہی ہے۔ معاشی نظام وہی ہے۔ اخلاق و معاشرت کا حال وہی ہے۔ مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی ہم کوئی قدم نہ اٹھا سکے، بلکہ قدم اٹھانے کے لیے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لیے ہماری سعی و جہد تو اسی غرض کے لیے تھی کہ ہم غلامی کے دور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی موثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں آٹھ سال سے اختلافات کی فصل بہا رہی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نہ نئی شان سے ابھرتے رہے ہیں اور ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنا چاہتا ہے دوسرا اس میں مداخلت کرتا ہے، اور دوسرا جو کچھ بنا چاہتا ہے کوئی تیسرا اسے بگاڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورت حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں اختلاف اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے اتفاق پانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے ذہن کو ان بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیے جن پر سب، یا کم از کم اکثر باشندگان پاکستان متفق ہو سکیں، جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔ ایسی بنیادیں تلاش کرنا وہ حقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجود نزاع کرید کرید کرنا کرنے کے بجائے اساسات اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا زاویہ نظر بدل جائے تو ہم باآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساسات اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں ہم انہیں اپنے مذہب میں

پا سکتے ہیں، اپنی تہذیب اور روایات میں پا سکتے ہیں، دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں اور عقل عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

یہ سطور اسی غرض سے لکھی جا رہی ہیں کہ چند اُن بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی جائے جن پر اتفاق ممکن ہے تاکہ سوچنے والے اُن پر غور کریں۔

سب سے پہلے ہم اُن اصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تحریری فضا کے بجائے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کہ اگر فضا ہی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظام زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا محال حاصل ہے۔

اولین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیے وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمان داری کے ساتھ ہو، دلائل کے ساتھ ہو، اور اسی حد تک ہے جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے، تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح مختلف نقطہ نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں۔ تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مزہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اُس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ جنگ میں سب کچھ حلال ہے، کالہیسی اصول اختیار کر کے اُس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے، اُس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے، اُس کے نقطہ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلاف ہو تو اسے غدار اور دشمن وطن ٹھہرائے، مذہبی اختلاف ہو تو اس کے پورے دین و ایمان کو متہم کر دے، اور ساتھ دھوکا اس کے بھیجے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصد زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پڑتی پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اخلاقی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکرر پیدا ہو جاتا ہے جو تعامل و غائبیت کے لیے نہیں بلکہ صرف تسام و فرات ہی کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی منفعت کا کوئی پہلو نہ ہو تو ہو مگر بحیثیت

مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر خود وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس یہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو، ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے، اختلافات میں رواداری، ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش اور دوسروں کے حق رائے کو تسلیم کرنا ہے کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے، لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نہج سکتا۔ پھر اس پر مزید غرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جاسکتی لہذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بد نیت ہے۔ یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اختلاف کو محالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے، اور معاشرے کے مختلف عناصر کو جنہیں بہر حال ایک ہی جگہ رہنا ہے، اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھ کر کسی مناسبت و مصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک مدت دراز تک معاشرے کے عناصر ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جیت تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے، یا پھر سب لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بد قسمتی سے نارواداری اور بدگمانی اور خود پسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک دہائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں۔ حکومت اور اس کے ارباب اقتدار اس میں مبتلا ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں۔ مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ استبیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولین تک اس کے زہریلے اثرات اتر گئے ہیں۔ اس کا ادا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرز عمل سے اپنے زیر اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعت ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام ان لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں یہ ہے کہ

بر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صرف کرنے اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے، مگر اس نفی کو اسی حد تک رہنا چاہیے جس حد تک وہ ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیے نہ نفی۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خواب کر دی جائے بعض لوگ تو اس منہی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں، اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں سرد سرد شخص جو موجود ہے اس کی اور اس کے کام کی پیروی مکمل نفی ہو جائے۔ یہ ایک نہایت غلط طریقہ کار ہے اور اس سے بڑی فحاشی رونما ہوتی ہیں اس سے لہجیاں پیدا ہوتی ہیں اس سے تعصبات ابھرتے ہیں اس سے عام بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طریقہ پر سوچنے کے بجائے تخریبی غرض پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش شخصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا مسئلہ پایا جاتا ہے جو ایک قیادت پر سے غور کا احتیاج اور جانے اور دوسری کسی قیادت پر نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ اس مسئلہ کو اگر کوئی چیز حل کر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک پسند یا متنو سے قوم کو مجتمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہوگا۔ لیکن اگر صورت حال یہ رہے کہ ہر ایک اپنا، اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا رہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بن سہری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدہ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیے یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر سے نہیں بلکہ دلائل سے منہ لٹے، اور جو کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ زور نافذ کرنے کے بجائے رغبت

تلقین سے لوگوں کو رضی کر کے نافذ کرے محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا ہے، اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اٹھے اور زبردستی اس کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریق کار کا لازمی نتیجہ کشمکش، مزاحمت اور بد مزگی ہے۔ ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضا مندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا مال و دولت کی یا نفوذ و اثر کی وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس طاقت کا استعمال کافی ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے، ملکوں کے نظام نہ دبلا کر دیے ہیں، اور ان کو پرامن ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر بے شکے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے بااثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اور اسی طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطہ نظر سے سوچنے کا جو گرہ بنا چاہیے۔ ایک مذہبی فریقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا، یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی کسی طرح مذمت کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود محسبوں کی بنا پر حسب اختیار کرنا شروع کرتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا تقاضوں کے لیے معرکہ آزمائی پر اترتے ہیں تو یہ چیز ملک و ملت کے لیے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جائے اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے جس کے برے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح

ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس فریقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے بھی اس کا تعلق ہو اُس کے ساتھ اُس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی، تباہ کن ثابت ہوگی ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے، اور تعصب کے مقابلے میں تعصب شکست کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھلا اُس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس ہی میں بربر پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے لیکن یہ حق دو غرضوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ ملک کی بھلائی ہی کے لیے خواہاں اور کوشاں ہوں۔ اور دوسری شرط یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصولی ہو اور مغتول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مغفود ہوگی اُس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کام کو محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کی پروا نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ تفرقوں کی ٹولی ہے۔ اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار و اقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو انکی جنگ بھی ملک کے لیے تباہ کن ہوگی اور صلح بھی۔

یہ پانچ اصولی تدابیر ہیں جن کی پابندی اگر ملک کے تمام عناصر قبول نہ کریں تو یہاں سرے سے وہ تضادی پیدا نہیں ہو سکتی جس میں نظام زندگی کی بنیادوں پر اتفاق ممکن ہو، یا بالآخر اس طرح کا کوئی اتفاق مصنوعی طور پر واقع ہو بھی جائے تو وہ عملاً کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مسا سحانہ تضاد میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ ملک کا نظام زندگی تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

ان میں سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو ملک کے اُستاد نظام کے لیے منبع ہدایت اور اولین ماخذ قانون تسلیم

کیا جائے۔ اس کو بنیاد اتفاق ہم اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور وہ اس بنیاد کے سوا کسی اور چیز پر رضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کا عقیدہ اس کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی تہذیب اور قومی روایات اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور ان کی ماضی قریب کی تاریخ بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کے لیے یہ گوارا کرنا سخت مشکل بلکہ محال ہے کہ جس خدا و جس رسول پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کے احکام سے وہ جان بوجھ کر منہ موڑ دیں اور ان کی ہدایات کے خلاف دوسرے طریقے اور قوانین خود اپنے اختیار سے جاری کریں۔ وہ کبھی ان طریقوں کو جاری کرنے میں سچے دل سے تعاون نہیں کر سکتے اور نہ ان قوانین کی برضا و رغبت پیروی کر سکتے ہیں کہ وہ عقیدۂ باطل اور اور غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر انہوں نے جان و مال اور آزادی کی ہونٹاں قربانیاں دیں وہ صرف یہ تھی کہ ہمیں غیر اسلامی نظام زندگی کے تحت جینا گوارا نہ تھا اور وہ اسے اسلامی نظام زندگی سے بدنا چاہتے تھے۔ اب ان سے یہ توقع کرنا بالکل بے جا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بخوشی اس اصل مقصد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے لیے انہوں نے اتنی گران قیمت چیز آزادی خریدی ہے۔ بلاشبہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اگر کوئی با برطانیہ زبردستی ان کے اس مقصد کے حصول میں مانع ہو جائے اور ان پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا رابطہ حیات مسلط کر دے تو وہ اسی طرح مجبوری کے ساتھ اسے برداشت کریں جس طرح انگریزی تسلط مانع ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے برداشت کیا تھا، لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایک ناراض مسند آبادی پر جبر سے ایک نظام مسلط کر کے اسے کامیابی کے ساتھ چلا یا جی جاسکتا ہے وہ یقیناً سخت نادان ہے۔

جن لوگوں کو اس بنیاد سے اتفاق نہیں ہے وہ چار طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ایک: وہ مسلمان جو اخلاق تہذیب اور ماضی میں اس عذوبہ مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انہیں اسلامی طرز زندگی کی طرف پلٹنے کے قصد ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دوسرے: وہ مسلمان جو مسلمان بننے سے پہلے ہی غیر مسلم بن چکے ہیں اور ان کا دماغ مغربی رنگ متاثر ہو چکا ہے۔ انہیں اب اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص جرائمات کے سبب ایک دینی دیکھو نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ وہی ان کے مزاج و مذاق سے مناسبت رکھتا ہے تاہم طبعاً ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے مگر سنت کو ٹھیکہ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں۔ اور جو تھے جتنے

میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں جو مسلمانوں کے دینی نظام کی بہ نسبت ایک غیر دینی نظام کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ اب کیا یہ انصاف ہے کہ ملک کا نظام اس بنیاد پر تعمیر نہ ہو جسے کروڑوں آدمی چاہتے ہیں اور اس بنیاد پر تعمیر ہو جسے چاہنے والے چند ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں؟ اور اگر بالفرض ایسا کیا بھی جائے تو کونسی طاقت ایسے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ان کروڑوں آدمیوں کا قلبی تعاون حاصل کرے گی؟ ہم ان حضرات سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے خیالات کو ایک سخت تبدیل کر دیں۔ البتہ جو بات ہم ان سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ملک کی بھلائی ایسی ہی بنیادوں پر اس کا نظام زندگی تعمیر کرنے میں ہے جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق ممکن ہو، اور یہ اتفاق بہر حال لا دینی پر یا قرآن بلا سنت پر ممکن نہیں ہے، لہذا آپ اپنے خیالات جو کچھ بھی چاہیں رکھیں، مگر فراموش نہ ہو جائیں۔

رہے ہمارے غیر مسلم ہم وطن، تو انہیں پہلے بھی بار بار اطمینان دلایا جا چکا ہے، اور اب بھی یہ اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی جائیگی کہ مسلمانوں کا مذہب آپ پر مسلط نہیں کیا جائے گا، آپ کے مذہب اور تہذیب میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی، آپ کا پرسنل لاء آپ کے لیے محفوظ رہے گا، اور آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہاں عملاً اس سے زیادہ حقوق حاصل ہونگے جو دنیا میں کہیں اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ مطالبہ آخر کس بنا پر تھی بجانب ہو سکتا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کی مرضی کے بجائے اقلیت کی مرضی کے مطابق بنے؟ اور اگر یہاں آپ سے مذہبی قوانین کو رائج نہیں ہونا ہے تو آپ کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے کہ یہاں کے ملکی قوانین اسلامی قانون کے اصولوں پر نہیں یا رومن لاء کے اصولوں پر؟ آپ کے لیے دونوں یکساں اقلیتی ہیں پھر کس بنا پر آپ ان میں سے ایک کے مخالف اور دوسرے کے طالب ہیں؟

قرآن و سنت کو بنیاد بنانے کے خلاف ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کی تعبیروں میں بکثرت اختلاف ہیں اور کوئی ایک تعبیر متفق علیہ نہیں ہے۔ یہی سنت۔ تو اس میں صرف تعبیرات ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر ملک کی آبادی کا اکثر حصہ متفق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی خاص تعبیر کو نہیں بلکہ مجائے خود قرآن کو، اور سنت کے متعلق کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ مجائے خود سنت رسول اللہ کو نظام زندگی کی بنیاد قرار دے رہے ہیں، اور یہ بنیاد ایک ناقابلِ محاط اقلیت کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ رہے اختلافات، تو وہ دو طریقوں سے آسانی حل ہو سکتے ہیں:-

اول یہ کہ مسلمانوں میں جو کہ وہ معتد بہ تعداد میں پائے جاتے ہیں مثلاً متنفذ، اہل حدیث، شیعہ، ان سے تعلق رکھنے والے معاملات پر قرآن کی اسی تعبیر اور سنت کی اسی تشریح کا اطلاق ہو جو ان کے نزدیک مستحکم ہو۔

دوم یہ کہ جو معاملات تمام ملک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں وہ تعبیر و تشریح عملاً تسلیم کی جائے جس پر اکثریت متفق ہو، اور اقلیت کے لیے یہ حق باقی رہے کہ وہ جائزہ و رد کے اندر رہتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کے حق میں اکثریت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

آئندہ صحبت میں ہم بتیہ بنیادوں پر مفصل گفتگو کریں گے۔ اس وقت جد کی قلت کے باعث یہ بحث ملتوی کی جاتی ہے۔

ایک مختصر بیگ نے مجھے تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۴۱ کے حاشیہ نمبر ۸۳ کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

”پھر ستر میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روز سے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام نعتا منسوخ نہ ہوئی تھی بلکہ مراضی، مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڑے لوگوں کے لیے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔“

اس کے متعلق انہوں نے فرمایا ہے کہ ”اس میں یہ تصریح نہ ہونے سے کہ مراضی وغیرہ کو بعد میں قضا

کے روزے رکھتے چاہئیں، آدمی اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ ان کے لیے صرف فدیہ دے دینا ہی کافی ہے۔
میں نے اس خیال سے اس مسئلے کی تصریح نہ کی تھی کہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی یہ فرما دیا ہے کہ ”وَمَنْ
كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ (اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں
میں روزوں کی تعداد پوری کرے)۔ لیکن جبکہ اس سے ایک عام ناظر کو غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے تو مناسب
یہی ہے کہ حاشیہ کے آخر میں حسب ذیل فقرے کا اضافہ کر دیا جائے:

”اور انہیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے ہی روزے رکھ لیں
جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہوں۔“

پندرہ روزہ

اسٹوڈنٹس وائس

کا

آزادی نمبر

۱۲ اگست کو شائع ہو رہا ہے

ایک جھلک:

- ★ دستور بنانے والوں کے نام۔۔۔ خوشیہ احمد ایم۔ بی۔ کام۔ سیاست اور اخلاق۔۔۔ ہمایوں اختر ایم۔ اے
- ★ مسلم معاشرہ میں تعلیم حسن العطاشی۔ بین الاقوامی حالات۔۔۔ محترم الدین عمری ایم۔ اے
- ★ طلسمی دوا۔۔۔ پیر و گریو اسلام۔۔۔ ہالینڈ۔۔۔ محمد جمیل

اور اس کے علاوہ سائنس کے کوششے۔ کالجوں کے اس پاس۔ آخری کالم سٹریٹ وغیرہ وغیرہ

منتجات ہم صفحات قیمت ہم آئے۔ پتہ: ۲۲ ٹیکس روڈ، کراچی ایجنٹ حضرات اپنی ذمہ داری سے مطلع کریں